عہد شاہی کا گمنام ناول: صوفیہ

ڈاکٹر سلمیٰ رفیق

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔110025، موبائل:9540844918

مرزا فدا علی خنجر لکھنوی نے اگر چہ زیادہ شہرت بطور شاعر حاصل کی، لیکن انھوں نے ادب کی دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی اور اردو ادب کے نثری سرمائے میں گراں قدر اضافے کیے۔ ''خمخانہ جاوید'' کے مطابق ۱۸۹۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ شعری اصناف کے علاوہ انھوں نے بڑی تعداد میں افسانے اور ناول بھی تحریر کیے۔ کم عمری میں ہی انھیں شاعری اور ادب کی دوسری اصناف میں دل چسپی پیدا ہوئی۔ ۱۹۰۹ء میں ان کا پہلا ناول ''ظالم عشاق'' منظر عام پر آ چکا تھا۔ اردو انسائیکلوپیڈیا کا بیان ملاحظہ ہو:

> ''آپ کو ۱۶۔۱۷ سال کی عمر میں شاعری کا شوق اور مضمون نویسی کا چسکا پڑا۔ اس کے بعد عرصے تک یہ سلسلہ جاری رہا اور اخباروں اور رسالوں میں نظمیں چھپتی رہیں۔ پھر نثر نویسی کا آغاز ہوا۔ اولاً خیالی مضامین لکھے جو رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ رفتہ رفتہ یہ شوق نثر نگاری اور ناول نویسی میں بدل ہو گیا..... آپ نے مختصر افسانے بھی سیکڑوں لکھے ہیں۔''

(اردو انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۶۲ء، ص:۶۸۵)

فدا علی خنجر کی تصنیف ''فرضی قبر'' ۱۹۲۵ء میں ہندوستانی پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اس میں ابتدائی صفحہ پر ''تصانیف و تراجم مرزا فدا علی خنجر لکھنوی'' کے عنوان کے تحت ۶۲ تصانیف کا نام درج ہے۔ اس فہرست میں ناولوں، افسانوں کے مجموعے، ترجمے، مرثیے اور دیگر نثری و شعری تخلیقات شامل ہیں۔ واجد علی شاہ کی تصنیف ''محل خانہ شاہی'' جو انھوں نے فارسی میں لکھی تھی مرزا فدا علی خنجر نے اس کا اردو میں ترجمہ کر کے ایک گراں قدر کارنامہ انجام دیا۔ اس تعداد سے قاری ان کے مقام کا کسی حد تک تعین کر سکتا ہے۔ خمخانہ جاوید کا بیان ملاحظہ ہو:

> ''۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ اس حساب سے اب چوبیس برس کا سن ہے سولہ برس کی عمر سے شعر گوئی کا مذاق شروع ہوا، پہلے چند غزلیں خواجہ عشرت لکھنوی کو دکھائیں۔ اب جناب سیف شاہجہاں پوری سے تلمذ اختیار کیا۔ چھ سات ناول بھی لکھ چکے ہیں۔''

(خمخانہ جاوید، لالہ سری رام (جلد سوم) دلی پرنٹنگ ورکس، ۱۹۱۷ء، ص:۵۹)

فدا علی خنجر کے تمام تخلیقی سرمائے ابھی تک خاطر خواہ تحقیقی اور منظم کام منظر عام پر نہیں آ سکا ہے اس بنا پر ان کی تمام تخلیقات کے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ زیادہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ مذکورہ بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے کئی ناول لکھے۔ کچھ تاریخی اور کچھ جاسوسی۔ انھی ناولوں میں سے ایک ناول ''صوفیہ'' ہے۔ یہ شاہی عہد کا ایک ناول ہے۔ اس ناول میں وہ تمام اجزائے ترکیبی اور خصوصیات پائی جاتی ہیں جو اس کو ایک کامیاب ناول بناتی ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں تاریخ اور اصلاح اردو ادب کے اہم موضوع رہے ہیں۔ اس دور کے ناولوں میں ہندوستانی اور بالخصوص مسلم سوسائٹی کی تاریخی، تہذیبی، سیاسی، معاشی، اخلاقی زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔ اس ناول کا انداز بھی وہی ہے جو اس دور کے دیگر ناول نگاروں یا کچھ بعد کے ناول نگاروں کا ہے مثلاً نذیر احمد، راشد الخیری، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر اور منشی سجاد حسین وغیرہ۔

فدا علی خنجر نے اس ناول میں پندرہ ابواب قائم کیے ہیں۔ ۱۰۹ صفحات پر ناول مشتمل ہے۔ مصنف سرورق پر ناول کے بارے میں رقم طراز ہے:

> ''عہد شاہی کا سبق آموز و نصیحت خیز، امیر خاندانوں کا پر اسرار راز، ایثار و نفس و اخلاق حمیدہ کا نادر مرقع۔''

ان چند الفاظ میں نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ ناول کا تعارف پیش کر دیا گیا ہے۔ زیر بحث ناول میں جہاں عہد شاہی اور اس سے وابستہ تاریخ سے متعلق بہت کچھ ملتا ہے وہیں ناول کی ابتدا اور تدریجی ارتقا میں جاسوسی ناول کا رنگ و آہنگ بھی ہے۔ ناول نگار کے لیے ایک نہایت اہم اور مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے کہ ناول کی ابتدا کس جملے سے کی جائے تا کہ قاری کا رشتہ ناول سے قائم ہو اور دلچسپی پیدا ہو جائے۔ اس ناول کے پہلے باب کا عنوان ''قیدی کا فرار'' ہی قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔

ناول نگار اپنے ناول کے لیے مواد اسی آب و گل سے حاصل کرتا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش میں ہونے والے حالات و واقعات سے متاثر ہوتا ہے اور انھی تجربات کی روشنی میں نقطۂ نظر قائم کر کے اپنا نظریۂ حیات پیش کرتا ہے۔ چوں کہ انیسویں صدی کے اوائل اور بیسویں صدی کے اواخر میں ادب پر مقصدیت

کا رجحان غالب تھا۔ شاید وقت کی ضرورت بھی تھی اور اصلاح و اخلاق پر خاصا زور تھا۔ نذیر احمد کا مذہبی نقطۂ نظر، راشد الخیری کا مسائل نسواں کی دہائی دینا، سرشار کا دنیا کے لیے بے فکری کا رویہ، شرر کا ماضی کی بازیافت اور مرزا فدا علی خنجر کا زمانے کی بے اعتباری اور تاریخ کی ورق گردانی نے اصلاحی، معاشرتی، تاریخی اور جاسوسی ناول کی مستحکم عمارت کے لیے بنیاد اور خشت اول کا کام کیا۔

ناول صوفیہ نصیر الدین حیدر غازی کے عہد حکومت کے بعد کے دور سے شروع ہو کر واجد علی شاہ کی معزولی اور پھر انگریز حکومت کے تسلط پر محیط ہے۔ ناول میں ہی اس کا بیان موجود ہے ملاحظہ ہو:

''یہ زمانہ امجد علی شاہ کا تھا۔ نصیر الدین حیدر اور محمد علی شاہ دس اور پانچ برس حکومت کر کے راہیِ ملک بقا ہو چکے تھے۔'' (ص:۷۰)

اسی طرح اس ضمن میں ذیل کا بیان بھی اہمیت کا حامل ہے:

''انہی ایام میں سرکار شاہی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے تعلقات میں کشیدگی کا آغاز ہو گیا۔ رفتہ رفتہ کدورتیں بڑھتی رہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۵۶ء میں انتزاع سلطنت ہوا۔ بادشاہ بقصد یورپ کانپور اور بنارس ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے اور وہ تمام کارخانہ گاؤ خورد ہو گیا۔ حاتم علی کی نظریں ان واقعات کا معائنہ کر رہی تھیں۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ عنقریب انقلاب ہونے والا تھا۔ وہ خوں ریز ایام قریب تر ہیں جب دیسی سورما تلواریں پکڑ پکڑ کر بدیسیوں پر ٹوٹ پڑیں۔ شہر کی گلیاں اور بازاریں کشتوں سے اٹ جائیں اور نہریاں گندے پانی کے عوض انسانی خون سے بھری نظر آئیں۔'' (ص:۸۸)

واجد علی شاہ کی مثنوی ''حزن اختر'' سے اس دور کے حالات اور واجد علی شاہ کے سفر کلکتہ اور پھر وہاں کے قیام کا حال معلوم ہوتا ہے۔ شعری سرمائے میں ''حزن اختر'' اور نثری سرمائے میں ناول ''صوفیہ'' اہم تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ ناول اس قسم کے ناول سے تعلق رکھتا ہے جس کو واقعاتی اور کرداری ناول کہا جاتا ہے۔ جس میں قصہ کی بھی اہمیت ہوتی ہے اور اعلیٰ درجہ کا کردار بھی پایا جاتا ہے۔ اس قسم کے ناول کی اچھی مثال ''فسانہ آزاد'' اور ''حاجی بغلول'' ہے۔ اس لیے کہ حاجی بغلول کی طرح ناول صوفیہ میں بھی مرزا کلب حسین خان (حامد حسین) کا کردار بھی ناول کے ہر باب میں پایا جاتا ہے۔ اہل دانش کے علم میں ہے کہ ناول کا فن شعوری تنظیم کا فن ہے۔ واقعات اور کردار کے درمیان ربط قائم کرنا تخلیق کار کا نصب العین ہوتا ہے۔ حامد حسین کا کردار قاری کو خبر دیتا ہے کہ یہ کردار مثالی اور توصیفی ہے جو شجاعت، جواں مردی اور حسن سیرت کا بہترین نمونہ ہے۔ کرداری ناول کے متعلق محمد احسن فاروقی رقم طراز ہیں:

''اس قسم کے ناول میں ناول نگار کردار کا ارتقا نہیں دکھاتا، بلکہ کردار کو نئے نئے حالات میں پیش کرتا اور لاتا ہوا دکھاتا ہے۔ ایک کردار کی دوسرے کردار سے مدبھیڑ کراتا ہے، مگر ان تمام حالات میں کردار اپنی خصوصیات بالکل تبدیل نہیں کرتے ہیں۔''

(ناول کیا ہے، محمد احسن فاروقی اور نور الحسن ہاشمی، دانش محل لکھنؤ، ۱۹۶۸ء، ص:۸۸)

ناول میں فدا علی خنجر نے حامد حسین کے کردار کو ایسا ہی دکھایا ہے۔ اس کی صفات پورے ناول میں ایک جیسی رہتی ہیں کہیں تبدل یا افراط و تفریط نظر نہیں آتی۔ کسی مقام پر اس کا کردار متزلزل ہوتا محسوس نہیں ہوتا ہے۔

ناول کے کردار اعلیٰ صفات سے متصف ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سارے کردار انسانی ہیں اور جیتے جاگتے محسوس ہوتے ہیں گویا ہمارے اردگرد ہوں۔ ان میں انسانی صفات بھی پائی جاتی ہیں جیسے حامد حسین، قربان حسین، حاتم علی اور ہمایوں جاہ کا کردار اور دوسری جانب کیشو سنگھ اور مہاجن کا کردار جو بنیادی انسانی اقدار سے بھی محروم ہیں۔ جن کے اندر لالچ اور طمع نے مضبوطی سے قدم جما رکھے ہیں۔ کردار متحرک اور فعال ہیں کسی قسم کے جمود کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ اس ناول کا پلاٹ ایک ہی ہے شروع سے آخر تک حامد حسین کی کہانی چلتی رہتی ہے، دوسرے کردار اور واقعات جڑتے رہتے ہیں۔ کردار نگاری کے لحاظ سے بھی یہ ناول پختگی کا حامل ہے۔ ناول کے کرداروں میں تخیل کے بجائے حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ سارے کردار ہمارے آس پاس اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ کرداروں کی پیش کش میں تصنع اور بناوٹ سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذریعہ اس دور کی سماجی اور سیاسی حقیقتوں کا اظہار کیا گیا ہو۔ اس ناول کی تہہ میں انسانی ہمدردی، اس کی باطنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ انسانی مکر و فریب اور لالچ و طمع کا امتزاج بھی ملتا ہے۔ حق و باطل اور خیر و شر اس دنیا کا مزاج ہے۔ پریم چند نے بجا لکھا ہے:

''میں ناول کو انسانی کردار کی مصوری سمجھتا ہوں۔ انسان کے کردار پر روشنی ڈالنا اور اس کے اسرار کو کھولنا ہی ناول کا بنیادی مقصد ہے۔ وہی ناول اعلیٰ درجے کے سمجھے جاتے ہیں جن میں حقیقت اور آدرش آمیز ہو گئے ہوں۔ ناول نگار کا کمال اس میں ہے کہ وہ ایسے کرداروں کی تخلیق کرے جو اپنے حسن عمل اور طرز فکر سے قاری کی دلچسپیوں کو جذب کر لیں، جس ناول کے کرداروں میں یہ خوبی نہیں وہ دو کوڑی کا ہے۔''

(اردو ناول کا نگار خانہ، کے۔ کے کھلر، سیمانت پرکاشن، نئی دہلی، ۱۹۸۳ء، ص:۵۰)

ناول چونکہ داستان کے بعد کی چیز ہے اور ناول نگاری میں داستانی مافوق الفطرت عناصر سے گریز کیا جاتا ہے، لیکن ظاہر ہے آن واحد میں کسی چیز کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ جاتے جاتے بھی کچھ اثر ایک زمانے تک باقی رہتا تھا۔ واجد علی شاہ کی بیگمات ہوں یا عبدالحلیم شرر کے ناول کے نسوانی کردار یا اس دور کے دوسرے تخلیق کار کی تخلیقات، کسی نہ کسی حد تک حسن اور قوت کا انداز اسی طرز کا دکھایا جاتا تھا جو انداز داستانوں کا تھا اگرچہ بہت کمی کے ساتھ۔ اس ناول میں حامد حسین کے کردار میں غیر معمولی شجاعت اور قوت دکھائی گئی ہے۔ کئی بار سپاہیوں اور بہت سے پیادوں کی موجودگی میں تن تنہا بچ کر نکل جانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے زور بازو سے جیل کی آہنی سلاخیں توڑ دیں اور فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ ملاحظہ ہو:

''ٹھیک اسی وقت ایک قوی ہاتھ نے قید خانے کے عقبی جھروکے سے نکل کر سلاخ کو مٹھی سے پکڑا اور اس زور سے اندر کی طرف کھینچا کہ لوہا ٹیڑھا ہوگیا اور سلاخ کا بالائی حصہ سوراخ سے نکل گیا۔''

(ص:۴)

ناول کی زبان سادہ، سلیس اور رواں ہے۔ مقفیٰ اور مسجع عبارت آرائی پورے ناول میں کہیں نہیں ملتی ہے۔ اس ناول کے مطالعہ سے آپ کو زبان اپنے معیار اور بلندی پر ملے گی۔ ان کی نثر سرسید احمد خان کی نثر سے متاثر نظر آتی ہے۔ ناول میں بعض الفاظ کا املا دور جدید کے املا سے مختلف ہے۔ اس دور میں اس طرح کا املا رائج تھا اور اس عہد کے دوسرے تخلیق کاروں کے یہاں بھی وہی انداز ملتا ہے، لیکن جدید دور میں وہ املا متروک ہوگیا ہے۔ مثال کے طور پر اب جہاں ''ں'' کا استعمال ہوتا ہے ان تمام الفاظ میں ''ن'' کا استعمال ہوا ہے۔ جن الفاظ میں ''ہ'' کے استعمال کا چلن ہے وہاں ''ھ'' کا استعمال کیا گیا ہے جیسے پہیا کو پھیا اور بہو کو بھو وغیرہ۔ ''ہ'' کی جگہ ''ھ'' کا استعمال اس دور میں رائج تھا۔ واجد علی شاہ کی تصانیف میں بھی یہ انداز ملتا ہے۔ کہیں کہیں یائے معروف کی جگہ یائے مجہول کا استعمال بھی کیا گیا ہے جیسے ''حتی'' کو ''حتے''۔ ثواب کو سواب، سوچ کو سونچ، اس کو اوس، ذریعوں کو ذریوں وغیرہ لکھا گیا ہے۔ اس میں پوربی بول چال کے الفاظ بھی ملتے ہیں جیسے ناگھنا، اٹھوارا، ڈھیلا وغیرہ۔ ایسے الفاظ بھی ہیں جو اردو کی گنگا جمنی تہذیب کے ترجمان ہیں مثلاً اشنان، بھوگ وغیرہ۔ زبان کے اعتبار سے بھی یہ ناول اہمیت کا حامل ہے۔

اعلیٰ انسانی اقدار اور اخلاق کی تربیت اس ناول کے ذریعے بخوبی کی جاسکتی ہے۔ حامد حسین لاوارث نوراللہ کی موت کے بعد اس کی مٹی کو آخری منزل تک پہنچانے کے لیے کیشو سنگھ سے التجا کرتا ہے جبکہ حامد حسین کا نوراللہ سے کوئی خونی یا جذباتی تعلق بھی نہیں تھا، صرف انسانیت کی خاطر وہ چاہتا تھا کہ ایک انسان کی بے حرمتی نہ ہو۔ ملاحظہ ہو:

''ہندو ہو یا مسلمان، بہر نوع تم بھی انسان ہو اور انسانوں کے فرائض میں ہمدردی شامل ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے چھوڑ دو۔ اگر تمہارے نزدیک میں قصور وار ہوں تو ضرور گرفتار کر لو، لیکن اتنی مہلت دے دو کہ اس غریب کی مٹی ٹھکانے لگا دوں جس نے ابھی ابھی تمہارے سامنے دم توڑا ہے۔'' (ص:۵۳)

اسی طرح حامد حسین کو جب معلوم ہوا کہ کیشو سنگھ مرزا کلب حسین (حامد حسین) کو ڈھونڈ نکالنے میں ناکام ہوگیا اور گرفتار کر کے دربار میں پیش نہیں کر سکا اور اپنی شکست تسلیم کرنے کے بجائے نیز انعام واکرام کی خاطر، اس نے کسی بے قصور کو پکڑ کر دربار میں پیش کر دیا کہ یہی مرزا کلب حسین (حامد حسین) ہے۔ اس طرح دربار سے ایک بے قصور کی پھانسی کا فرمان جاری ہوگیا کہ صبح اس کو پھانسی دی جائے۔ یہ خبر سن کر حامد حسین برداشت نہیں کر سکا کہ کوئی بے قصور اس کی جگہ پھانسی چڑھ جائے۔ انسانیت اور ایمانداری کی اعلیٰ مثال قائم کرتے ہوئے اس نے خود جا کر دربار میں پیشی دی اور ثابت کیا کہ اصل حامد حسین میں ہوں جس کی آپ لوگوں کو برسوں سے تلاش ہے۔ جسے گرفتار کیا گیا ہے اور پھانسی کا حکم دیا گیا ہے وہ بے قصور ہے۔ اس طرح اس بے قصور کی جان بچائی۔ حامد حسین نے دربار میں پہنچ کر، جہاں کچھ ہی دیر میں ایک بے قصور پھانسی پر چڑھا دیا جاتا کہا کہ:

''ظل اللہ! اصل مجرم دربار عالی میں حاضر ہے۔ کیشو سنگھ جس شخص کو گرفتار کر کے لایا ہے وہ شخص بے قصور ہے۔ چوں کہ مجھے اس کی خاطر جمعی کی عجلت ہے اس لیے رد وقدح سے پہلے ثبوت پیش کیے دیتا ہوں..... کلب حسین کی جرأت سے سب حیران رہ گئے، کوئی بھی اس طرح دوسروں کو بچانے کے لیے جان دینے نہیں آسکتا۔ وہ اپنے پاؤں سے مقتل میں چلا آیا۔''

(ص:۷۰۔۷۱)

اس ناول کے ذریعے نوجوان نسل کی تربیت بھی کی جاسکتی ہے اور ان کے لیے اس ناول میں اہم پیغام ہے۔ موجودہ زمانے میں اپنی چاہت تک رسائی نہ ملنے کی صورت میں ایک انسانیت سوز حرکت یعنی Attack Acid تک بھی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ عشق اور محبت ایثار اور قربانی کا نام ہے۔ وصل شرط نہیں ہے۔ جان چلی جائے لیکن محبوب کی عزت اور ناموس پر حرف نہ آئے۔ حاتم علی امیرزادہ ہونے کے باوجود اور عشق میں خود کو ختم کرنے کی تدبیریں کرنے والا، لیکن صوفیہ یا اس کے والد کی عزت یا غیرت کا پاس رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس کا بیان ملاحظہ ہو:

''آپ نے میرے ارمانوں کا خیال نہ کر کے صوفیہ کے دینے سے انکار کر دیا۔ میں آپ کی مرضی کے خلاف پوشیدہ طریقے سے صوفیہ کو

حاصل کرنا اپنی شرافت کے خلاف سمجھتا تھا....اب تک میں نے صوفیہ سے اپنے ارادوں کا اظہار نہیں کیا نہ ہی مرتے وقت کوئی ایسا لفظ زبان سے نکلے گا جس سے صوفیہ یا آپ کو تکلیف ہو۔''

(ص:۹۵۔۹۴)

اس دور کی سماجی، سیاسی، تہذیبی، اخلاقی اقدار کی شکست وریخت بھی اس ناول میں ملتی ہے۔غدر اور اس کے بعد کے حالات کی بھی جھلکیاں ہیں۔ برجیس قدر کے تخت سے بے دخل ہو جانے کے بعد انگریز اور ہندوستانی فوج کے درمیان تصادم میں ہندوستانی فوج کی صورت حال کیا تھی ملاحظہ ہو:

''اس کی بے قاعدہ فوج میں ایک دیہاتی جوان بھی شامل تھا۔جس کی پھٹی حالت ظاہر کر رہی تھی کہ دراصل نہ تو اسے انگریزوں سے مخالفت ہے اور نہ ہندوستانیوں سے موافقت، بلکہ محض روپیہ حاصل کرنے کی نیت سے جنگ میں شریک ہوا ہے۔اس کے لڑنے کا ڈھنگ بھی ایسا تھا جو بزدلی پر دلالت کرتا تھا۔حقیقت میں لڑنا تو برائے نام تھا صرف اس نے کشتوں کی کمریں ٹٹولنے کو لڑنے والوں کی فہرست میں نام لکھوا دیا تھا۔جہاں کسی کو گرتے دیکھا گولیوں کی ضو سے بچتا ہوا اس کے قریب پہنچا، جیبوں کی تلاشی لی اور جو کچھ نکلا ایک چیتھڑا پوش سیاہ فام نوخیز لڑکی کے حوالے کر دیا جو فوراً مورچے سے بھاگ کر کسی قریب کے کھنڈروں میں روپوش ہوگئی۔''(ص:۹۴)

اسی طرح جنگ کے بعد جو افراتفری تھی اس کا بھی ایک منظر ملاحظہ ہو:

''راہوں میں جابجا لاشیں پڑی تھیں۔مردار خور جانوران کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔جب آدمیوں کی چاپ کی آواز سنتے تھے تو بھاگ جاتے تھے۔یہ دونوں لاشوں کو پھاندتے نا نگھتے آگے بڑھ رہے تھے۔''(ص:۹۸)

مذکورہ بالا اقتباسات کی روشنی میں آپ اس دور کی سیاسی، فوجی اور اخلاقی صورت حال کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔جس فوج میں لوگ زخمیوں اور مرنے والوں کی جیبوں سے مال حاصل کرنے کے لیے شریک ہوں وہ اخلاقی پستی میں کہاں گر جائیں کہا نہیں جا سکتا ہے۔اس کا انجام کیا ہوتا ہے وہ وقت اور تاریخ نے ثابت کر دیا ہے۔اس طرح کے بہت سے حالات سے قاری کو آگاہی ملتی ہے۔

جذبات نگاری کی اگرچہ اعلیٰ مثالیں نہیں ملتی ہیں، لیکن کچھ مقامات پر جذبات اور احساس کی اچھی ترجمانی کی گئی ہے۔حاتم علی نے جب پہلی بار صوفیہ کو دیکھا اور دیکھتے ہی حسن وعشق کی دنیا میں قدم رکھ دیا۔اس کی کیفیت درج ذیل اقتباس میں ملاحظہ ہو:

''حقیقت میں آج کا روز حاتم علی کی زندگی میں عجیب با کیف انقلاب پیدا کر دینے والا روز تھا۔اس کے حسیات شباب میں مزیدار ہلچل مچ گئی تھی جو امنگیں اب تک لاعلمی اور بے حسی کے گہوارے میں پڑی آرام کر رہی تھیں، ذرا سے ٹھوکے میں نہایت شورش انگیز عنوان سے بیدار ہوگئیں۔ارمانوں نے دل میں خلش پیدا کر دی اور دماغ تخیل محبت سے لبریز ہوگیا۔ولولے ابھرے اور قیامت زا ہنگامہ لے کر ابھرے! امنگوں نے آنکھوں پر پٹی باندھنا شروع کر دی.... اب کچھ خیال تھا تو صوفیہ کا اور کچھ یاد تھی تو اس کے حسین وجمیل چہرے کی جس کی آفتاب کی طرح آنکھوں نے چکا چوند پیدا کر دی تھی۔آدھی رات گزر چکی ہے سارا زمانہ خواب راحت کے مزے لوٹ رہا ہے۔شاہد فلک (ماہ) نازنینان گردوں (انجم) کے جھرمٹ میں اپنے رخ نورانی کی جوت سے سونے والوں کے چہروں پر چاندنی سا سفید غازہ پھیر رہا ہے۔حاتم علی آرام دہ بستر پر خاموش لیٹا ہوا ماہ پارہ سے صوفیہ کی بے داغ صورت کا تقابل کرنے میں منہمک ہے۔'' (ص:۸۲)

پیکر تراشی کی مثال بھی ملتی ہے:

''آسمانوں پر کالے بادل چھائے ہیں۔موسلا دھار بارش ہو رہی ہے، لیکن حاتم علی سمجھ رہا ہے کہ صوفیہ نے چمک دار زلفیں بکھرا دی ہیں اور ان میں سے پانی کے قطرات آب باراں کی طرح برس رہے ہیں۔بجلی کی چمک خیال پیدا کرتی ہے کہ شاید صوفیہ کسی خیال میں مسکرا رہی ہے۔''(ص:۸۲)

اس دور کی سماجی اور طبقاتی کشمکش بھی اس ناول میں ملتی ہے۔کسان کی صورت حال، مہاجن کا استحصال، دیہاتوں کی حالت اور غربت، نوابوں اور امیروں کے گھروں میں کام کرنے والے ملازمین سبھی اس ناول میں چلتے پھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ایک مہاجن اپنے بیٹے کی شادی میں دہقاں کو دعوت دیتا ہے، دہقاں جو اعلیٰ نسب سے تعلق رکھتا ہے اور زمانے کی نامہربانی نے اس کو کھیتوں میں کام کرنے پر مجبور کر دیا تھا، نے کیا کہہ کر شرکت کرنے سے منع کر دیا ملاحظہ ہو:

''اس کے غرور نسبی نے ہر شخص کو اس کا دشمن بنا دیا تھا۔اتفاق سے ایک مرتبہ مہاجن نے اپنے بیٹے کی شادی میں نائی کو بھیج کر کسان کو مدعو کیا، لیکن اس نے صاف لفظوں میں کہلوا دیا کہ میں محض نائی کے آنے سے شریک نہیں ہوسکتا۔''(ص:۳۶)

اسی طرح ناول کے نسوانی کردار صوفیہ کے حسب نسب کے بارے میں جب تک مرزا کلب حسین خان کو علم نہیں ہوا اس نے حاتم علی کے والد قربان حسین سے اتنی قربت کے باوجود رشتہ کرنے کی بات کرنے کی جرأت نہیں کی اور قربان حسین کو بھی جب تک مستند ذرائع سے تصدیق نہیں ہوگئی وہ اپنے بیٹے کی

شادی صوفیہ سے کرنے پر خود کو رضا مند نہ کر سکا۔ جب کہ صوفیہ میں وہ تمام خوبیاں اور عادات واطوار تھے جو کسی نجیب الطرفین میں ہوتے ہیں۔ درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

''قربان علی خان فکروں میں مبتلا ہو گیا۔ مخفی نور اللہ کے بیان کو کسی طرح سچ نہیں مانا جا سکتا جب تک اس کی شرافت خاندانی کی دلیل نہ ہو۔ وہ شریف النسل سہی مگر صوفیہ کی والدہ نہ جانے کس خاندان اور کس قوم کی لڑکی تھی؟ دیر تک غور کرتا رہا کبھی بیٹے کی محبت میں نکاح کرنے پر آمادہ ہو جاتا کبھی شکوک نسبی خاندان میں دھبہ لگانے سے مانع ہوتے۔'' (ص:۸۸)

جس دور میں میں یہ ناول تحریر ہوا اس دور میں لڑکیوں کی تعلیم کا نہ عام اور مناسب انتظام تھا اور نہ ہی رواج تھا۔ ایک طرح سے لڑکیوں کی تعلیم کو معیوب ہی سمجھا جاتا تھا، لیکن اس عہد میں بھی بہت سے لوگوں نے اصلاح معاشرہ کی طرف توجہ کی اور لڑکیوں کی تعلیم کی حوصلہ افزائی کی۔ اس سلسلے میں تقریر اور تحریر دونوں سے کام لیا گیا مثلاً نذیر احمد نے اپنے خطبات میں لڑکیوں کی تعلیم پر توجہ دلائی۔ بہت سے مصنّفین نے مضمون اور ناول بھی لکھے۔ اس ناول میں فدا علی خنجر نے بھی صوفیہ کا کردار ایک نہایت تربیت یافتہ اور پڑھی لکھی لڑکی کا دکھایا ہے۔ جس دور میں لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہیں ہوتا تھا صوفیہ کے اندر کلیات سعدی پڑھنے اور سمجھنے کی صلاحیت تھی جب کہ غور طلب ہے کہ صوفیہ کی پرورش بہت نامساعد حالات میں ہوئی تھی۔ اس سے لڑکیوں کی تعلیم کا خیال اور ترغیب پیدا ہوتی ہے۔ مصنف رقم طراز ہے:

''صوفیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حاتم علی کی طرف کتاب سرکا دی۔ اس نے ورق الٹ کر دیکھا اتفاق سے پہلے اسی شعر پر نظر پڑی:

دلم بردہ نگارے، ماہروے شوخ عیارے
بسنتی جامہ پوشے، بادہ نوشے ہشت سرشارے

صوفیہ پر یہ شعر بالکل چھا رہا تھا۔ جس قدر اوصاف شعر کے دونوں مصرعوں میں قائل نے بیان کیے، حسن اتفاق سے صوفیہ میں موجود تھے۔ وہ ماہرو بھی تھی اور شوخ عیار بھی۔ اس کے حسین پیکر میں بسنتی لباس بھی تھا اور بادہ حسن وشباب سے مست وسرشار بھی۔''

(ص:۸۴)

دور جدید میں بچہ مزدوری (Child labour) ایک قومی اور بین الاقوامی مسئلہ بن گیا ہے۔ یہ مسائل ظاہر ہے ہر زمانے میں رہے ہیں۔ بلکہ پہلے بچوں کا گھروں میں کام کرنا زیادہ عام تھا کیوں کہ اسکول جانے اور بھیجنے کا اس درجہ رواج ہی نہیں تھا۔ اس ناول میں صوفیہ زمانے کی ستم ظریفی کے باعث پرورش کے لیے جن کے حوالے کی گئی تھی وہاں وہ کس قسم کی زندگی گزار رہی تھی اور کن مشکلات سے دوچار تھی اس سے ہر دردمند دل کی آنکھیں نم ہو جائیں گی ملاحظہ ہو:

''اس کی عمر چھ اور سات سال کے درمیان تھی۔ بساط سے زیادہ محنت اور مشقت نے لاغر اندام اور کمزور کر دیا تھا۔ لڑکی نے کنویں سے گھڑا گھسیٹ کر نکالا۔ بار بار پانی کے بوجھ سے وہ اسی کے ساتھ کنویں کی طرف بڑھ جاتی تھی، لیکن کبھی گراری کا کھمبا اور کبھی جگت پکڑ کر اپنے آپ کو کنویں میں گرنے سے محفوظ رکھتی تھی۔ اس کے نازک بازوؤں میں اتنی قوت نہیں تھی جو وہ پانی سے بھرا گھڑا نکال سکتی۔ بڑی دقت سے گھڑا کھینچ کر کمر پر رکھا اور رسی لپیٹ کر کندھے پر ڈالی اور گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ بوجھ سے لڑکی کی کمر دوہری ہوئی جاتی تھی ہر مرتبہ معلوم ہوتا تھا کہ اب گری کہ جب گری۔''

(ص:۵۴)

اس پر مستزاد یہ کہ گھر پہنچ کر گالی اور مار بھی پڑتی تھی کہ اتنی دیر کیوں لگادی۔

تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی جب بڑی سے بڑی حکومتیں اور ان کی تہذیبیں روبہ زوال ہوتی ہیں تو ابتری، بد حالی، مکر وفریب، اخلاقی تنزل اور سماجی ناانصافی ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ تصنع، جھوٹ، خوف وہراس، لوٹ مار اور حکمران وقت سے قربت کے لیے جائز وناجائز تمام کوششوں اور عیاریوں کا بازار گرم ہوتا ہے۔ بلا شبہ اسی میں عہد زریں کی وہ چنگاریاں بھی دبی ہوتی ہیں جو آگے چل کر مستقبل کی تعمیر نو میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اگر چہ یہ شعور آہستہ آہستہ ہوتا ہے۔ فدا علی خنجر کا عہد بھی ایک عظیم تہذیب کی بھڑکتی ہوئی لو کا عہد تھا۔ اودھ کے شاہی دور کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ لکھنؤ پر انگریزوں کا تسلط تھا اور حکومت ان کے ہاتھ آ گئی تھی۔ ہر طرف ابتری پھیل گئی تھی۔ غدر اور اس کے بعد زندگی تضاد اور بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہے۔ سماج اور افراد سبھی ایک طرح کی بے چینی اور غیر مستحکم نظام کے تحت جی رہے ہیں۔ اس دور کی سماجی اور سیاسی زندگی کی خامیاں طشت از بام کرنے کی سعی اس ناول میں ملتی ہے۔ قاری کے ذہن پر بھی ایک بے یقینی اور خوف کی فضا طاری ہو جاتی ہے۔ بلا شبہ یہ کسی تخلیق کار کی بڑی کامیابی ہے کہ وہ قاری کو اپنی گرفت میں لینے میں کامیاب ہو جائے۔ ان تمام صورت حال کی جھلکیاں اس ناول میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ ناول تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ خاص طور سے غدر سے پہلے اور بعد کے لکھنؤ، فیض آباد، کانپور اور گرد ونواح کے حالات کے لیے یہ ناول دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

◆◆◆

◆◆◆